جماعتِ اسلامی کا تاریخی کردار

(عبدالحمید صدیقی)

[اس مضمون کی پہلی قسط انتخابات سے پہلے ترجمان القرآن جلد ۷۶ عدد ۳ میں شائع ہو چکی ہے۔ اس میں جماعت اسلامی نے اسلام کے معاشی نظام کے خدوخال واضح کرنے کے لیے جو کوشش کی ہے اس کا ذکر کیا گیا تھا۔ درجِ ذیل مضمون میں سیاسی میدان میں جماعت اسلامی کی خدمات کا تذکرہ کیا جا رہا ہے)۔

جماعت اسلامی کی سیاسی خدمات کو صحیح طور پر جانچنے کے لیے یہ ضروری ہے کہ سب سے پہلے اُن حالات پر نگاہ ڈالی جائے جن میں جماعت نے اپنے کام کا آغاز کیا۔ یُوں تو سیّد احمد شہیدؒ اور شاہ اسماعیل شہیدؒ کی شہادت کے بعد ہی، لیکن خاص طور پر ۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی کی ناکامی کے بعد غیر ملکی حکمرانوں نے مسلم قوم کے ساتھ جو ظالمانہ طرزِ عمل اختیار کر رکھا تھا، اور اس اندوہناک صورتِ حال کو بدلنے کے لیے مسلمانوں کے بعض بہی خواہ انہیں جس راہ پر گامزن ہونے کا مشورہ دے رہے تھے اُس میں کسی انقلاب انگیز سیاسی شعور کے بیدار ہونے کے کوئی امکانات نہ تھے۔

انگریز کی سرپرستی میں جنم لینے والی انڈین نیشنل کانگرس آغاز میں جس نہج پر اور جس رفتار کے ساتھ آگے بڑھ رہی تھی اُس میں مکمل آزادی کا تصوّر بھی نہ کیا جا سکتا تھا مگر مسلمانوں کی اِس جماعت میں شمولیت نے اسے ایک انقلابی جماعت بنا دیا۔ خصوصاً مولانا محمد علی جوہر، مولانا حسرت موہانی اور مولانا ابوالکلام آزاد کی وجہ سے اس جماعت میں غیر معمولی حرکت اور حرارت پیدا ہوئی۔ اس سے پورے ہندوستان میں آزادی کی تحریک کو غیر معمولی تقویت پہنچی مگر اس تحریک میں ہندو اور مسلمان مختلف احساسات کے ساتھ شریک ہوئے۔ ہندوؤں کے لیے تو یہ محض بدیشی آقاؤں کی جگہ دلیسی آقاؤں کی فرمانروائی کا مسئلہ تھا اور اس وجہ سے ان کے فکر و عمل کا محرک مغرب کی جارحانہ قوم پرستی کا وہ فلسفہ تھا جو بیسویں صدی کے آغاز میں پوری دنیا

کے دل و دماغ پر چھایا ہوا تھا۔ اس فلسفے کی رُو سے کسی قوم کا وطن کبریائی کے مقام پر فائز تھا اور اس میں الوہیت کی وہی شان پیدا کی جا چکی تھی جو معبودِ حقیقی میں ہوتی ہے۔ اُس دور کے ہندو مصنفین اور شعراء نے ہندوستان کی تعریف و توصیف اور اس کی محبت میں جو مضامین اور نظمیں لکھی ہیں اُن میں مغربی وطن پرستی اور قوم پرستی کی جھلک پوری طرح دکھائی دیتی ہے۔ ہندوستان کا قومی نغمہ بندے ماترم وطن کی خدائی کا ہر اعتبار سے عکس پیش کرتا ہے۔

مگر مسلمانوں کا معاملہ ہندوؤں سے بالکل مختلف تھا۔ جہاں تک وطن کی محبت اور غیر ملکی استعمار سے اس کی گلو خلاصی کی تڑپ کا تعلق تھا وہ ہندوستان کی دوسری اقوام سے کہیں آگے تھے اور اس راہ میں بڑی سے بڑی قربانی دینے میں انہوں نے کبھی تامل سے کام نہ لیا۔ چنانچہ جب تحریکِ آزادی نے زور پکڑا تو مسلمان فوراً سروں پر کفن باندھ کر میدان میں اُتر آئے اور انہوں نے استخلاصِ وطن کی خاطر ایسی قربانیاں دیں جن کی تاریخ میں بہت کم مثالیں ملتی ہیں۔ خصوصاً علماء نے انگریزی سامراج کا جس پامردی سے مقابلہ کیا اور اس کے تسلّط کو ختم کرنے کے لیے جس ہمت اور ایثار کا ثبوت دیا وہ تاریخ کا ایک عظیم کارنامہ ہے۔

لیکن جب ہم آزادیٔ وطن کی ان کوششوں کا ذرا گہری نظر سے جائزہ لیتے ہیں تو ہمیں یہ بات صاف طور پر دکھائی دیتی ہے کہ مسلم قوم اگرچہ تحریک آزادی میں تو پیش پیش تھی مگر وہ جس نظریہ اور احساس اور جس مقصد اور نصب العین کے حصول کی خاطر اس تحریک میں شریک تھی وہ ہندوؤں کے جذبہ و احساس اور آدرش سے بالکل مختلف تھا۔ ہندو تو اہلِ مغرب کے قوم پرستی کے نظریہ سے سرشار ہو کر انگریز کے خلاف محض اس لیے صف آرا تھا کہ ہندوستان پر ایک غیر ملکی قوم نے غلبہ حاصل کر رکھا تھا اور وہ اس ملک کے وسائل کو بڑی بے دردی کے ساتھ لوٹ رہی تھی۔ مسلمانوں کے نزدیک یہ صورتِ حال بھی اگرچہ ناقابلِ برداشت تھی کہ کوئی قوم کسی دوسری قوم کی آزادی سلب کر کے اُسے غلام بنائے اور اُس کے وسائل کا استحصال کرے مگر تحریکِ آزادی میں اُن کی شرکت کا محرّک اس سے کہیں زیادہ ارفع و اعلیٰ مقصد تھا۔ وہ انگریزی تسلّط کے اس وجہ سے خلاف تھے کہ اُن کی نظر میں انسان پر انسان کی خدائی بنیادی طور پر غلط اور باطل ہے۔ انسان صرف اُس خالق اور مالک کی بندگی کے لیے پیدا کیا گیا ہے جو اس پوری کائنات کا حاکم ہے۔ اس ایک حاکم کے علاوہ ہر دوسرے حاکم کی حاکمیت انسان کی تذلیل ہے۔ سروری صرف اسی ذات کو زیب دیتی ہے باقی سب جھوٹے خداؤں کی پرستش ہے۔ قدرتی طور پر مسلمانوں کے

دلوں میں تحریکِ آزادی میں شمولیت اختیار کرتے ہوئے جہاں یہ جذبہ کارفرما تھا کہ اس ملک سے انگریز کی خدائی ختم کی جائے وہاں یہ احساس بھی پوری شدت سے موجود تھا کہ اس خدائی کے خاتمے کے بعد کائنات کے حقیقی خالق اور مالک کی خدائی قائم کرنے کا التزام کیا جائے۔ فکر و نظر کے اس اساسی اختلاف اور اس سے پیدا ہونے والے مسائل کو بالکل شروع ہی سے بھانپا جا سکتا ہے۔ جو لوگ تحریکِ آزادیِ وطن کی تاریخ پر نگاہ رکھتے ہیں وہ اس اختلاف کو ہر گام پر اچھی طرح محسوس کر سکتے ہیں۔ ہندوؤں کے نزدیک آزادیِ وطن کا مقصد صرف اسی قدر تھا کہ بدیشی خداؤں کو یہاں سے نکال کر اُن کی جگہ دیسی خداؤں کو خدائی کے تخت پر متمکن کر دیا جائے، اور معاشی میدان میں آزاد ہندوستان کو غیر ملکی استحصال سے بچا لیا جائے۔ ان دو مقاصد کے علاوہ ہندوستان کی غیر مسلم اقوام کے سامنے آزادی کا کوئی دوسرا مقصد نہ تھا۔ مگر مسلمانوں کے سامنے سب سے بڑا مسئلہ یہ تھا کہ آزادی کے بعد جب دیسی خدا کبریائی کے مقام پر فائز ہوں گے اور اُن کی حاکمیت کا سکہ ملک میں ہر سُو چلے گا تو کیا اُن کے لیے دینی اعتبار سے یہ صورت گوارا ہو گی؟۔ یہ وہ مقام تھا جہاں مسلمانوں کے سوچنے کی راہیں دوسری اقوام سے بالکل مختلف ہو جاتیں۔ اُن کے لیے حاکمیتِ خداوندی کے سوا ہر دوسری حاکمیت باطل ہونے کی وجہ سے کسی طرح بھی قابلِ قبول نہ تھی۔ اس لیے وہ تحریکِ آزادی میں بڑھ چڑھ کر حصہ لینے کے ساتھ ساتھ اس نقشے کو بھی جاننے کے آرزومند تھے جس کے مطابق آزاد ہندوستان میں انہیں انسان کی خدائی سے نجات حاصل ہو گی اور وہ حاکمیتِ الٰہی کے تحت آرام اور سکون سے زندگی بسر کر سکیں گے۔

سیاسی میدان میں اختلاف کا دوسرا مظہر مسئلۂ قومیت تھا۔ ہندوؤں کے ہاں مغرب کا تصورِ قومیت کافی حد تک سرایت کر چکا تھا اور وہ زبان کی حد تک یہ تسلیم کر چکے تھے کہ قومیت کا خمیر خاکِ وطن سے اٹھایا جاتا ہے اور وہ سارے باشندے جو ایک وطن کے اندر بستے ہیں وہ قومیت کے رشتے میں منسلک ہو جاتے ہیں۔ مسلمانوں کے لیے قومیت کا یہ تصور اُن کے مذہبی تصوّرات سے مغائرت رکھتا ہے۔ اسلامی قومیت کی بنیاد عقیدے کا اشتراک ہے۔ اس لیے یہ قومیت کبھی بھی وطن، رنگ اور نسل کی تنگ پہنائیوں میں اپنے آپ کو محبوس نہیں کر سکتی۔ اس کا مزاج بین الاقوامی ہے اور اس کا دائرہ پوری انسانیت پر محیط ہے۔ جو شخص بھی، خواہ وہ کسی وطن کا باشندہ ہو، کسی نسل سے تعلق رکھتا ہو، وہ خواہ کوئی زبان بھی بولتا ہو اور کسی رنگ کا بھی ہو اگر وہ کلمہ طیبہ کو اس کے مقتضیات کے ساتھ قبول

کر لیتا ہے تو وہ اسلامی برادری کا رکن بن جاتا ہے اور اس میں اُس کا مرتبہ و مقام دنیوی جاہ و جلال سے متعین نہیں ہوتا بلکہ نیکی، پاکبازی، خدا خوفی اور پرہیزگاری کی بنیاد پر متعین ہوتا ہے۔ قومیت کا یہ تصور تو دنیا کی دوسری اقوام کے لیے بھی بالکل نرالا ہے مگر اسے وہ قوم آخر کس طرح ہمدردی کے جذبات کے ساتھ سمجھ سکتی ہے جس نے اپنی قوم کے اندر ذات پاک کی صورت میں ہزاروں قید خانے بنا رکھے ہیں اور اُن کے اندر اپنے آپ کو بند کرنے ہی میں اپنی عافیت اور اپنا کمال سمجھتی ہے۔ جہاں تک ہندوؤں کے ابنائے وطن ہونے کا تعلق ہے مسلمان اُن کے لیے عزت و احترام کے وہی جذبات رکھتے تھے جو ایک شریف شہری کے دوسرے شریف اور امن پسند شہری کے لیے ہونے چاہییں۔ وہ ان کے دکھ درد میں بھی شریک ہونا چاہتے تھے مگر اُن کے لیے قومیت کی کوئی ایسی شکل گوارا نہ تھی جو اُن کے مذہبی معتقدات سے متصادم ہو۔ وہ دنیا کے دوسرے مسلمانوں کے ساتھ رشتۂ اخوت کو اس لیے توڑنے پر تیار نہ تھے اور نہ ہو سکتے ہیں کہ انھوں نے ہندوستان سے باہر کسی دوسرے وطن میں جنم لیا ہے۔

وطن اور قوم کے بارے میں ہندوؤں اور مسلمانوں کے اساسی تصورات میں اختلاف کا ادراک تحریکِ آزادی کے بالکل ابتدائی ایام میں بھی کیا جا سکتا تھا اور اس کے لیے ناقابلِ تردید ثبوت بھی فراہم کیے جا سکتے ہیں لیکن اس بات کی تصدیق کے لیے کہ ہندوؤں نے مغربی نیشنلزم کے زیرِ اثر یہ جدوجہد شروع کی اور مسلمانوں نے دینی تقاضوں کے تحت اس فرض کو سرانجام دینے کی کوشش کی یہ بات کافی ہے کہ ہندوؤں کے ہاں اس تحریک میں زیادہ تر وہ لوگ شامل تھے جنہوں نے مغربی طرز کی درسگاہوں میں تعلیم حاصل کی تھی۔ ہندوؤں کے مذہبی طبقے بالعموم اس تحریک سے الگ تھلگ رہے مگر مسلمانوں میں مذہبی طبقے نے اس میدان میں سب سے زیادہ قربانیاں دیں۔ آزادئ وطن کے لیے جن لوگوں کو جان و مال سے محروم ہونا پڑا، یا جنہیں اس راہ میں ناقابلِ بیان مصائب و شدائد سہنے پڑے اُن کی اگر فہرست تیار کی جائے تو "ملّا" کی تعداد یقیناً سب سے زیادہ نکلے گی۔ اس کی وجہ صرف ایک ہی ہے کہ مسلمانوں کے نزدیک انسان پر انسان کی خدائی کا خاتمہ ایک مذہبی فریضہ ہے جسے بہر طور ادا کرنا چاہیے۔

گذشتہ پچاس سال میں مسلمان خواہ آزادئ وطن کی کسی تحریک سے وابستہ رہے ہوں مگر اُن کے عمل کا محرک صرف یہی ایک احساس تھا کہ انہیں آزاد ہندوستان میں ایسے حالات میسّر آجائیں جن میں وہ خدا کی حاکمیت کے تحت اسلام کے مطابق زندگی بسر کر سکیں۔ بعض تحریکوں کے مزاج کو سمجھنے اور اُن کے

چھپے ہوئے عزائم کو جاننے میں تو غلطی ہو سکتی ہے اور اس معاملے میں ملت کے بعض سربراہوں سے اختلاف بھی کیا جا سکتا ہے مگر اس معاملے میں قطعاً کوئی اختلاف نہیں کہ مسلمانوں کی عظیم اکثریت کے نزدیک آزادیِ وطن آخری منزل نہ تھی بلکہ حصولِ منزل کا بالکل ابتدائی مرحلہ تھی۔ اُن کے پیشِ نظر آزادی کی جدوجہد کے ساتھ ساتھ تین کام بڑے اہم تھے:

(ا) انہیں ہر مرحلے پر یہ فکر دامنگیر رہتی کہ مسلم قوم جس دینی احساس کے تحت استخلاصِ وطن کی تحریک میں شامل ہے وہ احساس نہ صرف زندہ رہے بلکہ اُس میں غیر معمولی اضافہ ہو کیونکہ اس احساس کے مضمحل ہونے سے مسلم قوم کے اندر اضمحلال پیدا ہونا بالکل ناگزیر ہے۔ ان کے اس خدشے کے متعدد وجوہ تھے جن میں سب سے بڑی وجہ باطل افکار و نظریات کا وہ خوفناک طوفان تھا جو مغربی استعمار کے ساتھ ہی اس سرزمین پر اُمڈ پڑا تھا۔ مغربی تعلیم مسلمانوں کی نوخیز نسلوں کو دین سے برگشتہ کر رہی تھی۔ پھر ہندوستان کی تحریکِ آزادی میں جو غیر مسلم شامل تھے اُن کی بہت بڑی تعداد مذہب کی مخالف یا اُس سے لاتعلق اور مغربی نظریات کی دل و جان سے شیدائی تھی۔ ان حالات میں اس بات کا شدید خطرہ تھا کہ کہیں یہ طوفان مسلمانوں خصوصاً نوجوانوں کو بھی اپنے ساتھ بہا کر نہ لے جائے اور وہ وطن کو آزاد کرانے کرانے اپنے دین اور اپنے ایمان سے نہ ہاتھ دھو بیٹھیں۔ یہ خدشہ کچھ اس بنا پر بھی شدید تھا کہ اس تحریک میں جو غیر مسلم انقلابی ہونے کی بنا پر عوام میں مقبول تھے اور اس تحریک کی روحِ رواں خیال کیے جاتے تھے وہ نہ صرف مغربی نیشنلزم کے علمبردار تھے بلکہ کمیونسٹ بھی تھے اور اپنے الحاد پر علانیہ فخر کیا کرتے تھے۔ اِن حالات میں مسلمانوں کے دینی احساسات کو بچانے کا کام بھی انتہائی ضروری تھا۔

(ب) دوسرے اس بات کی بھی شدید ضرورت محسوس کی جا رہی تھی کہ دینی جذبے کو برقرار رکھنے کے لیے اُسے علمی بنیاد فراہم کرنا بالکل ناگزیر ہے محض جذبہ خواہ وہ کتنا ہی صادق ہو، زندہ رہنے کے لیے شعور کا محتاج ہے۔ اگر محض اندھے جذبات پر دنیا ہمیشہ کے لیے قائم رہ سکتی تو اوہام کے بلبلے کبھی نہ ٹوٹتے بلکہ انہیں بھی اسی طرح بقا نصیب ہوتی جس طرح کہ حقائق اور سچائیوں کو حاصل ہے مگر ہم دیکھتے ہیں کہ جس جذبے کو ذہن سہارا نہیں دیتا یا جس احساس کی آبیاری علم کے چشمے سے نہیں ہوتی وہ جذبہ احساس جلد ہی افسردہ ہو کر مرجاتا ہے۔

(ج) تیسرے مسلمانوں کے بہی خواہوں کے سامنے یہ مسئلہ بھی درپیش تھا کہ اُمت کے سامنے احیاءِ دین

کا جو مقدس نصب العین پیش کیا جا رہا ہے اس کے عملی مضمرات کیا ہیں کیونکہ استخلاصِ وطن کے فوراً بعد پہلا سوال یہ سامنے آئے گا کہ اب اس ملک کی تعمیرِ نَو اسلامی تعلیمات کے مطابق کس طرح کی جائے اور اس راہ کی عملی دشواریوں کو کن کن طریقوں سے حل کیا جائے۔ اِس نوعیت کے سوالات آزادی سے بہت پہلے ہی ذہنوں میں پیدا ہونے شروع ہو چکے تھے، خصوصاً نوجوان نسلیں اسلام کے سیاسی نظام اور اسلام کے معاشرتی نظام اور اسلام کے معاشی نظام کی تفصیلات سمجھنے کی شدید آرزومند تھیں۔ اور وہ دورِ حاضر میں ایک صحیح اسلامی ریاست کے خدوخال کو جاننے کے لیے بیتاب نظر آتی تھیں۔

اِن سارے مسائل اور حالات کو سامنے رکھ کر اگر جماعت اسلامی کے تاریخی کردار کا جائزہ لیا جائے تو یہ بات کسی جذبۂ فخر کی بنا پر نہیں بلکہ محض تحدیثِ نعمت کے طور پر کہی جا سکتی ہے کہ جماعت نے اس سلسلے میں فکر و عمل کے دونوں میدانوں میں عظیم خدمات سرانجام دی ہیں۔ یہاں ہم اختصار کے ساتھ اُن کا تذکرہ کرتے ہیں۔

(۱) مولانا مودودی کی چار کتابیں یعنی مسلمان اور موجودہ سیاسی کش مکش حصہ اوّل، دوم، سوم اور مسئلہ قومیت ہماری ملّی تاریخ میں سنگِ میل کی حیثیت رکھتی ہیں۔ مولانا کی ان بیش قیمت تحریروں نے نہ صرف مسلمانوں کے دینی احساسات کو قوت و توانائی بخشی بلکہ انہیں ٹھوس علمی اور فکری بنیادیں فراہم کر کے اُن کے اندر استحکام پیدا کیا۔ مسلمان اور سیاسی کشمکش حصہ اوّل میں مولانا نے مسلمانوں کے مذہبی احساسات کو بیدار کیا اور انہیں بتایا کہ آزادیٔ وطن بلاشبہ ایک نیک مقصد ہے مگر مسلمان کے نزدیک یہ مقصد ثانوی حیثیت رکھتا ہے، اس کی حیثیت تدبیرِ منزل کی سی ہے، منزل کی نہیں۔ اس کی زندگی کا اصل مقصد اس سے کہیں زیادہ بلند اور ارفع و اعلیٰ ہے۔ اُسے صرف ہندوستان کے باشندوں کو انگریز کی غلامی سے نجات دلانے کے لیے پیدا نہیں کیا گیا بلکہ اسے پوری انسانیت پر سے انسان کی خدائی کو ختم کرنے کا فرض سونپا گیا ہے۔

اس کتاب میں مولانا نے "اسلام ایک جامع تہذیب کی حیثیت سے" جو فکر انگیز مقالہ لکھا ہے اُس کے متعلق یہ بات پورے وثوق کے ساتھ کہی جا سکتی ہے کہ اس نے فکر و نظر کی دنیا میں ایک انقلاب برپا کر دیا۔ مسلمانوں کے ہاں یہ احساس بلاشبہ پہلے سے موجود تھا کہ اُن کا دین صرف زندگی کے ایک گوشے تک محدود نہیں بلکہ پوری زندگی پر حاوی ہے لیکن اس تصور کے جو عملی مضمرات و مقتضیات تھے وہ اس

مضمون سے واضح ہوئے اور اُن کے اندر اس بات کا شعور بیدار ہوا ہے کہ آزادیٔ وطن کی تحریک میں انہیں کن احساسات کے ساتھ شریک ہونا چاہیے۔ اس کتاب نے مسلمانوں کے دل و دماغ کو پوری قوت سے جھنجوڑا اور انہیں اپنے اصل فرائض اور مرتبہ و مقام سے آگاہ کیا۔ مسلمانوں کو خود آگاہی کا درس دینے میں اس کتاب کا بہت بڑا حصہ ہے۔ پھر اس کتاب سے مسلمانوں کے دل و دماغ میں ابنائے وطن کے ساتھ اختلافات کے وہ واضح نقوش بھی اُبھرنے لگے جنہیں وہ پہلے تحت الشعور میں محسوس کرتے تھے مگر وہ انہیں شعور کی سطح پر سمجھنے سے قاصر تھے۔ آزادیٔ وطن کے دل و جان سے خواہشمند ہونے کے باوجود وہ وطنی تحریک میں کھل کر شامل ہونے میں متامل نظر آتے۔ ہندو مسلمانوں کے اس طرزِ عمل پر طعنہ زنی کرتا اور اسے استعمار پسندی اور غلامانہ ذہنیت پر محمول کر کے اسے رُسوا اور ذلیل کرتا اور دنیا کو یہ تاثر دیتا کہ ہندوستان کا مسلمان اب غلامی پر راضی ہو چکا ہے اور وہ اس غلامی کے بدلے انگریزی سامراج سے دنیوی فوائد حاصل کرنا چاہتا ہے۔ صرف مسلمانوں کے لیے ہی نہیں بلکہ دنیا کے لیے یہ ایک معمہ تھا کہ مسلمان دوسرے اقوام کے مقابلے میں کہیں زیادہ حریت پسند ہونے اور اس راہ میں اُن سے کہیں زیادہ ایثار کرنے کے باوجود سامراجیوں کے ایجنٹ ہونے کا طعنہ سُن رہے ہیں اور جن لوگوں کو مسلمانوں نے تصورِ آزادی سے آشنا کیا وہ حریت پسندی کے دعویدار بنے بیٹھے ہیں۔ مولانا کی اس کتاب نے شکوک و شبہات کے جتنے کانٹے تھے انہیں نکال دیا اور علمی تجزیہ کے ساتھ بتایا کہ آزادیٔ وطن کی یہ تحریک جن عناصر سے عبارت اور جس مزاج کی حامل ہے اور جن مقاصد کے حصول کے لیے آگے بڑھ رہی ہے اُن کے بہت سے پہلو ایسے ہیں جن کے ساتھ مسلمان ذہنی طور پر مطابقت پیدا نہیں کر سکتا۔ ہندوستان کی دوسری اقوام چونکہ مذہب کا کوئی ایسا جامع تصور نہیں رکھتیں جو زندگی کے سارے گوشوں پر محیط ہو اس لیے انہیں حصولِ آزادی کے بعد تعمیرِ نو کا ہر وہ نقشہ قابلِ قبول ہے جس سے ملک اور قوم کو مادی لحاظ سے فائدہ ہو۔ اُن کے لیے استخلاصِ وطن کا مسئلہ صرف آقاؤں اور حکمرانوں کی تبدیلی کا مسئلہ ہے مگر مسلمانوں کے لیے یہ مسئلہ بڑا پیچیدہ اور نازک ہے کیونکہ اس کا تعلق ان کے دین اور ایمان سے ہے۔ انہیں بلاشبہ وطن کی آزادی عزیز ہے اور اس معاملے میں وہ اپنے ہم وطنوں سے کسی لحاظ سے بھی پیچھے نہیں مگر وہ چونکہ ایک ایسے دین کے علمبردار ہیں جو حیاتِ انسانی کے سارے شعبوں پر پوری طرح حاوی ہے اس لیے وہ اجتماعی زندگی کی کوئی ایسی شکل گوارا نہیں کر سکتے جو اُن کے دینی تصورات سے مغائرت رکھتی ہو

یا اُن سے متصادم ہو۔ اُن کے نزدیک یہ مباحث کہ وطن پہلے ہے یا دین پہلے، سرے سے بیکار مباحث ہیں کیونکہ مسلمان کی نظر میں دین زندگی میں صرف اوّلیت کا مقام ہی نہیں رکھتا بلکہ زندگی کے ہر گوشے اور قلب و دماغ کے ہر ریشے میں حکمرانی کا مقام رکھتا ہے اسے زندگی میں اس طرح تفوق اور برتری حاصل ہے کہ اس کے مقابلے میں دنیا کی ہر دوسری چیز ہیچ اور بیکار ہے۔ مسلمان اوّل تا آخر اور سرتا پا مسلمان ہی ہے اور اس کے علاوہ اس کی کوئی دوسری حیثیت نہیں اور اسی حیثیت میں وہ ہر قول اور فعل کی قدر و قیمت متعین کرنے کا پابند ہے۔ اس کے نزدیک آزادی کی بھی اگر کوئی قدر و قیمت ہے تو اس لیے نہیں کہ اس کے حاصل ہونے سے کوئی قوم غیر ملکی حکمرانوں کی لوٹ کھسوٹ سے نجات حاصل کر لیتی ہے بلکہ اس کی قدر کی وجہ بھی صرف یہ ہے کہ خالق نے انسان کو آزاد پیدا کیا ہے اس لیے کوئی انسان بھی دوسروں کو غلام بنانے کا مجاز نہیں۔ اُس پر صرف اپنے خالق کی بندگی واجب کی گئی ہے۔ اس ایک بندگی کے علاوہ وہ ہر دوسری بندگی سے انسان بالکل بے نیاز ہے۔

مولانا نے ایک طرف تو مسلمانوں کو اُن کے صحیح موقف اور اُن کے حقیقی نصب العین کو واضح کر کے انہیں اپنے اصل کام اور فرض سے آگاہ کیا اور دوسری طرف ہندوستان کی سب سے بڑی وطنی تحریک انڈین نیشنل کانگرس کے چہرے سے نقاب کشائی کر کے یہ بتایا کہ یہ صرف آزادیٔ وطن کی تحریک نہیں بلکہ بڑے جارحانہ عزائم لے کر آگے بڑھ رہی ہے۔ مغربی قوم پرستی کا نظریہ اس کے رگ و پے میں پیوست ہے۔ الحاد سے اس کا خمیر تیار ہوا ہے اس لیے مسلمانوں کے اساسی تخیلات سے اس کا تصادم بالکل ناگزیر ہے۔ مولانا کی یہ کتاب اتنی معرکۃ الآرا تھی کہ اس کے شائع ہوتے ہی مسلمانوں کی سیاسی زندگی میں ایک تلاطم پیدا ہو گیا اور اُن پر بعض ایسے حقائق واضح ہوئے جنہیں وہ کبھی کبھی محسوس تو کرتے تھے مگر جن کا انہیں پوری طرح ادراک نہ تھا۔ اس کتاب نے یوں تو مسلمانوں کے سارے طبقوں کو متاثر کیا مگر خاص طور پر وہ حریت پسند طبقے بڑے متاثر ہوئے جو مسلمان کی حیثیت سے اس جنگِ آزادی میں شریک ہونا چاہتے تھے۔

پھر اس کتاب کا یہ اثر بھی دیکھنے میں آیا کہ مسلمانوں کے مختلف طبقے ایک دوسرے سے چھٹ کر الگ ہونے لگے۔ مسلمانوں کا وہ طبقہ جو مغربی تصورات، الحاد اور اشتراکیت کو پوری طرح قبول کر چکا تھا اور محض نام کے اعتبار سے مسلمان رہ گیا تھا اس نے اپنی سرگرمیوں کے لیے الگ میدان تلاش کر لیا مگر وہ لوگ جنہیں اسلام دنیا کی ہر دوسری متاع سے عزیز تر تھا انہوں نے یا تو مختلف تحریکات کو چھوڑ کر اپنے

آپ کو جماعت اسلامی سے وابستہ کر لیا یا اگر اُن کے ساتھ رہے بھی تو اسلام کے معاملے میں زیادہ حساس اور چوکس ہو کر رہے اور اس بات کا برابر خیال کرتے رہے کہ جس قافلہ میں وہ شریک ہو کر چل رہے ہیں وہ انہیں اسلامی نقطۂ نظر سے بربادی کی طرف تو نہیں لے جا رہا۔ یہ اُن کے اس احساس کا نتیجہ تھا کہ مسلمانوں کی دینی سرگرمیوں میں اضافہ ہُوا تاکہ مختلف لادینی تحریکات نے جو زہر پھیلایا تھا اُس کے اثرات کو زائل کرنے کا التزام کیا جائے۔

مولانا کی تحریروں سے پہلی بار مسلمانوں کو نیشنلزم کی تباہ کاریوں کا اندازہ ہُوا اور انہیں یہ معلوم ہُوا کہ اُن کا تصوّرِ قومیت مغرب کے اس جارحانہ تصوّر سے کس قدر مختلف ہے اور یہ تصور انسانیت کے لیے مغربی قوم پرستی کی ستمرانیوں کے مقابلے میں کس حد تک خیر و فلاح کا موجب ہے۔ اس کے علاوہ مولانا نے اشتراکیت کے خطرے کو اچھی طرح بھانپتے ہوئے مسلمانوں کو اس آنے والے طوفان سے متنبہ کیا اور بڑے ٹھوس دلائل اور شواہد سے ثابت کیا کہ یہ معاشی بدحالی کو دُور کرنے کا کوئی پروگرام نہیں جسے قبول کر لیا جائے بلکہ یہ ایک ملحدانہ تحریک ہے جو الحاد کو دنیا میں پُوری طرح مسلط کرنے کے لیے اٹھی ہے۔ یہ انسانیت کے خلاف ایک خوفناک سازش ہے۔ اس کے پھلنے پھولنے سے مذہبی اقدار تباہ ہوتی ہیں۔ اخلاق کی مٹی پلید ہوتی ہے اور دینی معتقدات کو ناقابلِ تلافی نقصان پہنچتا ہے۔ اس ضمن میں مولانا نے پُوری قوت کے ساتھ مسلمانوں کو یہ حقیقت ذہن نشین کرانے کی کوشش کی کہ "معاشی اصلاح کا یہ پروگرام کسی ملک میں اس وقت تک نافذ نہیں ہو سکتا جب تک کہ مذہب کی پُوری طرح جان نہ نکل جائے، کیونکہ اُس کی زندگی اس کے لیے موت کا پیغام ہوتی ہے، اس لیے وہ سب سے پہلے مذہب کا خاتمہ کرتا ہے اور پھر اُس کی لاش پر اپنی بادشاہی کا تخت بچھاتا ہے، اگر اس لاش میں حرکت کرنے کی کوئی معمولی سی قوت بھی باقی رہے تو اشتراکیت کی حکمرانی قائم نہیں ہو سکتی۔

(باقی)